بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

امریکہ پاکستان کے مفادات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بھارت کو جو بے پناہ امداد دے رہا ہے، وہ نہ صرف بین الاقوامی معاملات میں مکروفریب اور بے وفائی کی ایک نہایت ہی عبرتناک داستان ہے بلکہ "چچا سام" کے فہم و فراست کے دیوالیہ پن کی بڑی واضح دلیل ہے اور اسے دیکھ کر اس کے مستقبل کا آسانی کے ساتھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس امداد سے ایشیا کے اندر طاقت کا توازن بالکل بگڑ کر رہ جائے گا جو بالآخر پوری دنیا کی سیاست کے اندر اختلال پیدا کر دیگا۔

بھارت شروع ہی سے جس پالیسی پر عمل کر رہا ہے وہ اُس کے استعماری عزائم کی کھلے طور پر نشاندہی کرتی ہے۔ امن اور آشتی کے اس علمبردار نے سب سے پہلے تو اُن ریاستوں کو نگلنا شروع کیا جو کسی طرح بھی اس کی زد میں آسکتی تھیں، اور اس طرح اپنے پڑوسیوں پر عرصۂ حیات تنگ کرنے لگا۔ خصوصاً پاکستان کے ساتھ اُس نے جو جارحانہ رویّہ اختیار کر رکھا ہے اُس کی کسی اچھے اور شریف ہمسایے سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ پھر بین الاقوامی تعلقات میں اُس نے مختلف ممالک بالخصوص روس اور اینگلو امریکن بلاک کے ساتھ جو آنکھ مچولی کھیلی ہے اور ان دونوں طاقتوں سے اپنی عیاری کے ذریعہ جس طرح وہ فائدہ اٹھاتا رہا ہے، اُسے دیکھ کر اس بات کا بآسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اس ملک کے سربراہ کسی اخلاقی ضابطے کے پابند نہیں بلکہ صرف مادی مفادات کے پرستار ہیں۔ اس طرزِ عمل سے انہیں وقتی طور پر بلاشبہ کچھ فوائد حاصل ہوئے ہیں اور بڑے بڑے ممالک کو کسی حد تک بیوقوف بنانے میں انہیں تھوڑی سی کامیابی بھی نصیب ہوئی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو تاریخ پر نگاہ رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس طرح کا بے اصولا پن

کسی ملک اور قوم کو تادیر کامیابی سے ہمکنار نہیں رکھ سکتا۔ اگر کوئی قوم خود غرض بھی ہو تو کم از کم اسے بساطِ سیاست پر اپنے مفادات کے مہروں کو بیدار مغزی کے ساتھ چلانا پڑتا ہے اور اس راہ کی معمولی غفلت بھی تباہی و بربادی کا باعث بنتی ہے۔ خالقِ کائنات نے قوموں کے فنا و بقا میں اس امر کا خاص طور پر التزام کر رکھا ہے کہ مستقل کامرانی انہیں لوگوں کے حصے میں آئے جو اخلاق کی مثبت اقدار کے پابند ہوں۔ چالبازیاں اور عیّاریاں وقتی طور پر کسی قوم کے لیے نفع کے حصول کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ لیکن ان کے بل بوتے پر آج تک کسی فرد یا گروہ نے زیادہ دیر تک قوت اور عزت حاصل نہیں کی۔ انسانی تعلقات کی بساط پر قینی منافقانہ چالیں بھی چلی جائیں گی وہ ان چالیں چلنے والوں کو مختلف مصائب میں گرفتار کرتی چلی جائیں گی۔

گزشتہ دو صدیوں میں برطانیہ سے زیادہ شاطرانہ روش کس ملک نے اختیار کی ہے؟ لیکن اس کا جو عبرتناک انجام ہوا ہے وہ آج پوری دنیا کے سامنے ہے۔ مشرقی ممالک سے اُس کا اثر بالکل ختم ہو کر رہ گیا ہے اور اس کی جگہ امریکہ اور روس دونوں حیرت انگیز سرعت کے ساتھ نفوذ کرتے جا رہے ہیں۔ سیاسی چالبازیاں "جان بل" کو گھیر گھار کر ایک ایسے مقام پر لے آئی ہیں جہاں وہ ایک پٹے ہوئے مہرے کی طرح بالکل بے بسی کے عالم میں اپنی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اس کی کس مپرسی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ قوم جس کا کبھی یہ دعویٰ تھا کہ اُس کی وسیع و عریض سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا اُس کا آج یہ حال ہے کہ فرانس جیسا کمزور ملک بھی اُسے مُنہ لگانے پر تیار نہیں ہے۔ یورپ کی مشترکہ منڈی کی تشکیل میں انگریز کو جس ذلّت آمیز طریق سے نظر انداز کیا گیا ہے وہ شاطرانہ حربوں کے انجام پر نہایت کھلے طریق سے دلالت کرتا ہے۔

آج برطانیہ کا لے دے کر ایک ہی دمساز اور غمخوار رہ گیا ہے اور وہ امریکہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان بعض ایسے تہذیبی رشتے موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ دونوں قومیں ایک دوسرے

کے ساتھ کسی حد تک وابستگی محسوس کرتی ہیں لیکن بین الاقوامی حالات جس سُرعت کے ساتھ تبدیل ہو رہے ہیں اُسے دیکھتے ہوئے یہ تعلق بھی بالکل ناپائیدار معلوم ہوتا ہے۔ ان دونوں ممالک کے سیاسی اور معاشی مفادات کا آپس میں ٹکرانا بالکل ناگزیر ہے۔ اور مادیت پرستی کے اس دور میں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ دنیا کی کوئی قوم تہذیبی تعلقات کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کو قربان کرنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ چنانچہ لنکا کے معاملے میں برطانیہ نے جس طرح امریکہ سے صرفِ نظر کیا ہے اُس سے آنے والے حالات کے رُخ کا کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت جو صورتِ حال پیدا ہو رہی ہے اس کے پیشِ نظر دنیا میں تین بلاک ابھر رہے ہیں۔ ایک امریکہ اور برطانیہ۔ دوسرا یورپ۔ اور تیسرا کمیونسٹ۔ مسلمان ممالک کے ایک الگ بلاک بننے کے نہایت واضح امکانات موجود تھے، لیکن افسوس کہ ان کے سربراہوں کی غفلت اور کوتاہ بینی نے اس چوتھے بلاک کی تشکیل کو کافی حد تک ناممکن بنا دیا ہے۔

اسلام جو مسلمانوں کی عظیم اکثریت کے لیے آج بھی فکر و عمل کا سب سے بڑا محرک اور اُن کے درمیان پائیدار تعلقات کے استوار کرنے کا واحد ذریعہ ہے، اُس کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے۔ اور اس کی جگہ مغرب کے ملحدانہ افکار و نظریات کو امتِ مُسلمہ کے دل و دماغ پر بالجبر ٹھونسنے کی مختلف سازشیں ہو رہی ہیں۔ اس سے مسلمان ممالک کے اندر ایک خلفشار موجود ہے۔ مصر، عراق، شام، پاکستان، افغانستان، انڈونیشیا اور ٹرکی، ان میں سے کوئی ملک بھی ایسا نہیں جس میں انتشار موجود نہ ہو۔ پاکستان کو چھوڑ کر دنیا کے تمام مسلمان ممالک میں افکار و نظریات کی یہ کشمکش کئی مرتبہ خون آشام انقلابات کی صورت اختیار کر چکی ہے لیکن ابھی تک وہاں کے رہنے والے اس بات کا کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پائے کہ انہیں اپنے مستقبل کی تعمیر کس بنیاد پر کرنی ہے۔ کیا وہ قلب و دماغ کی پوری یکسوئی کے ساتھ کفر کی راہ اختیار کریں گے یا وہ پورے اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ اسلام کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اساس بنانے کے لیے کوئی مؤثر

قدم اٹھائیں گے مسلمان جب تک اس امر کا کوئی آخری فیصلہ نہیں کرتے اُس وقت تک اُن کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہو سکتا۔ کفر و اسلام کے درمیان اس گومگو اور تذبذب کی پالیسی کی وجہ سے اُن کی طاقت روز بروز کمزور ہوتی چلی جائیگی اور اُن کی قوتیں ایک مرکز پر مجتمع ہونے کی بجائے منتشر رہیں گی جنہیں حوادث کے تھپیڑے جس طرف چاہیں گے اڑا کر لے جائیں گے۔

مصر، شام اور عراق کے اتحاد کو جو ابھی صدر ناصر کی زیر سرپرستی قائم ہوا ہے بعض سادہ لوح دنیائے اسلام کے روشن مستقبل کی پہلی کرن تصوّر کرتے ہیں۔ خدا کرے کہ ایسا ہی ہو اور مسلمان کسی ایک مرکز پر جمع ہو کر کفر کی یلغار کا مقابلہ کر سکیں۔ لیکن سطحی جذباتیت سے ہٹ کر جب ہم اس اتحاد کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اس کی حیثیت ایک مقدس خواہش سے زیادہ کچھ بھی معلوم نہیں ہوتی۔ ہمارے سامنے جو سوال سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے وہ یہ ہے کہ آج اس اتحاد کی بنیاد کیا ہے۔ وہ کونسا ایسا نصب العین ہے جس کی مقناطیسی کشش ان مائل بہ انتشار اجزاء کو باہم جوڑ کر انہیں ایک مضبوط قوت بنا دے گا۔ اگر یہ عرب نیشنلزم ہے تو پھر ہم نہایت واضح طور پر یہ کہتے ہیں کہ یہ بنیاد بڑی بودی اور کمزور ہے۔ نیشنلزم میں اب اتنی طاقت نہیں رہی کہ اُس سے مختلف ممالک کے درمیان اتحاد کا کام لیا جا سکے۔ اور اگر اسی جذبہ کو قوت و طاقت کے زور سے ان ممالک میں اُبھارنے کی کوشش کی گئی تو مسلمانوں کے اندر مزید انتشار پیدا ہو گا۔

کسی اندرونی یا بیرونی خطرے کی وجہ سے ممکن ہے کہ یہ تھلے ،، یا ان میں سے چند ممالک وقتی طور پر باہم مل بیٹھیں۔ لیکن دَر نفس الواقع کوئی تعمیری قوت نہیں ہے جو ان ممالک کے رہنے والوں کے اندر فکر و نظر کی ہم آہنگی پیدا کر سکے، ان کی خفتہ قوتوں کو بیدار کر کے انہیں ترقی کی راہ پر لگا دے، اُن کے دل و دماغ میں جاہلی عصبیتوں کے جو جھاڑ جھنکار حیرت انگیز تیزی کے ساتھ اُبھر رہے ہیں، صاف کر کے وہاں نیکی اور شرافت کے بیج بو دے۔ افکار و نظریات اور احساسات و جذبات کا یہ ہمہ گیر انقلاب صرف اسلام کو پورے اخلاص کے ساتھ اپنانے ہی سے آسکتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات

بڑے رنج کے ساتھ کہنی پڑتی ہے کہ اس اتحاد میں قوت و استحکام کے اس لازوال اور انتھاہ خزانے کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا گیا ہے۔

پھر اس مصنوعی اتحاد کے پیدا کرنے میں جس قسم کی مسلسل سازشیں کی جارہی ہیں انہیں دیکھ کر اس کے متعلق کوئی اچھی توقعات وابستہ نہیں کی جاسکتیں۔خفیہ انقلاب کے ذریعہ سے جو چند فوجی افسر اچانک برسرِ اقتدار آگئے ہوں ان کے باہم مل بیٹھنے سے تو مختلف ممالک کے لوگ باہم متحد نہیں ہوسکتے۔اُن کے اندر کسی پائیدار اتحاد کی بنیاد رکھنے کے لیے یہ بات اشد ضروری ہے کہ سب سے پہلے عوام کے اندر اس کے لیے آمادگی پیدا کی جائے۔یہ کوئی جوا نہیں جسے کوئی طاقتور ہاتھ پکڑ کر لوگوں کی گردنوں پر ڈال دے اور اس طرح وہ باہم متحد رہنے پر مجبور کر دیئے جائیں۔اس کے لیے سب سے پہلے داخلی تبدیلی پیدا کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔جو انقلابات جوڑ توڑ اور خفیہ سازشوں کے ذریعے معرض وجود میں آتے ہیں وہ قوموں کو طاقتور اور مضبوط بنانے کی بجائے انہیں زیادہ کمزور بنا دیتے ہیں،اور ایسے انقلابیوں کا اتحاد کبھی قوموں کا صحت مند اتحاد نہیں بن سکتا۔درحقیقت اس وقت تمام عرب ممالک ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر بیٹھے ہوتے ہیں اور اُن کی اجتماعی زندگی میں ہر وقت اچانک زلزلے آتے رہتے ہیں۔اضطراب،بے چینی،اور بے یقینی کی اس فضا میں جو لوگ دنیائے اسلام کے کسی مستقل اور پائیدار اتحاد کی،جو لوگوں کی آرزوؤں اور امنگوں کا مظہر ہو،توقع رکھتے ہیں،وہ بہت بڑی خوش فہمی کا شکار ہیں۔

ان مسلمان ممالک کے علاوہ مشرق میں صرف دو طاقتیں ایسی رہ جاتی ہیں جن کے ہاتھ میں ایشیا کی قیادت آسکتی ہے۔ان میں ایک چین ہے اور دوسری بھارت۔چین کے امکانات سب سے زیادہ روشن تھے لیکن اب امریکہ بھارت کی جس طریقے سے پشت پناہی کر رہا ہے اُس سے حالات بھارت کے حق میں پلٹ گئے ہیں اور خطرہ یہی ہے کہ اب چین کی بجائے بھارت مشرق کے لیے

دیوِ استبداد ثابت ہوگا۔

رُوس اور چین کے درمیان عقیدے اور مسلک کا اتحاد ہے اور اس وجہ سے چین اپنے اس حلیف پر اعتماد کر سکتا ہے۔ لیکن روس نے اس وقت اس ملک کے متعلق اپنی جو روش اختیار کی ہے اُسے دیکھ کر ذہن میں فطری طور پر بہت سے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ بھارت اور چین کے درمیان شدید اختلافات ہیں اور ان اختلافات کی وجہ سے اُن کے درمیان سرحدی جھڑپ بھی ہو چکی ہے۔ لیکن روس ابھی تک بھارت کی دوستی کا اسی طرح دم بھر رہا ہے جس طرح کہ وہ ان اختلافات سے پہلے بھرتا تھا۔ اُس کے رویے میں قطعاً کوئی فرق نہیں آیا۔ نیتوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ لیکن حالات کا مطالعہ یہ بتا رہا ہے کہ روس مشرقِ وسطیٰ میں اپنے استعماری عزائم کی تکمیل میں چین کی اُبھرتی ہوئی طاقت کو سدِ راہ سمجھتا ہے اور اس وجہ سے اس کی ترقی کو وہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ آغاز میں تو وہ اپنے چینی حلیف کے لیے ہر قسم کے ایثار پر آمادہ تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ چین اُس کے ایک وفادار ایجنٹ کی حیثیت سے مشرق میں اپنے آقا کے حق میں حالات کو سازگار بنانے کے لیے مخلصانہ کوشش کرے گا لیکن اُس پر جس وقت سے یہ راز منکشف ہوا ہے کہ چین خود اپنے بھی کچھ عزائم رکھتا ہے اور وہ ایشیا میں اپنی ہی قیادت اور سیادت قائم کرنے کا خواہاں ہے، اُس وقت سے روس کے رویے میں خاصی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ روس کو یہ خطرہ بھی لاحق ہے کہ کہیں بھارت بالکل ہی امریکہ کی گود میں نہ چلا جائے اور اس سے طاقت کا توازن بگڑ جائے۔ یہ وجوہ اگر نہ ہوتے تو آج روس اور بھارت کے درمیان بھی اختلافات کی اتنی وسیع خلیج حائل ہو جاتی جتنی کہ چین اور بھارت کے درمیان ہے۔ لیکن ان دونوں ممالک کے درمیان تعلقات خاصے خوشگوار ہیں۔

پھر چین کے اندر اشتراکیت نے ارتقاد اور ترقی کی جو صورت اختیار کی ہے اُس سے بھی روس کچھ زیادہ خوش نہیں۔ وہ ہر قدم پر یہ محسوس کرتا ہے کہ چین اس کا تابعِ مہمل بننے کی بجائے اپنی انفرادیت

برقرار رکھنے پر مُصر ہے اور اپنے آپ کو کلّی طور پر اُس کی غلامی اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ وہ کچھ اپنے الگ مقاصد اور اپنے مخصوص مفادات بھی رکھتا ہے اس لیے اشتراکیت کا علمبردار ہونے کے باوجود ان کے درمیان من و تُو کے سارے حجابات ابھی تک زائل نہیں ہوئے اور یہ حجابات کسی وقت بھی بیگانگی کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ یورپ میں حالات نے جو نئی کروٹ لی ہے اُس نے روس کے اثر و نفوذ کے امکانات کو وہاں کافی حد تک روشن بنا دیا ہے۔ فرانس نے برطانیہ پر مشترک منڈی کی شرکت کے دروازے بند کر کے اس کو سیاسی اور معاشی اعتبار سے زبردست زک پہنچائی ہے لیکن وہ ابھی اپنے آپ میں یہ سکت نہیں پاتا کہ خود اپنی طاقت کے بل بوتے پر یورپ کی زمام کار سنبھال سکے۔ وہ اس معاملے میں کسی زبردست ہاتھ کا محتاج ہے جو آڑے وقت میں اُس کے لیے مضبوط سہارا بن سکے۔ اس ضمن میں آخری چارۂ کار اشتراکی روس کی سرپرستی ہے۔ یہی وہ واحد طاقت ہے جو یورپ کی چھوٹی اور کمزور سلطنتوں کے اتحاد کو ایک مؤثر قوت بنا سکتی ہے اور امریکہ اور برطانیہ کی ریشہ دوانیوں سے نہایت کامیابی کے ساتھ نمٹ سکتی ہے۔ یورپ اگر برطانیہ اور امریکہ کے تسلط سے آزاد ہو کر ایک نئے پیکر میں ڈھلنے کا عزم رکھتا ہے تو وہ روس کا دست نگر ہونے پر مجبور رہے۔ اس کی تائید اور حمایت کے بغیر اُس کا شیرازہ مجتمع نہیں ہو سکتا۔ خود روس کے لیے یورپ میں اثر و نفوذ کرنے کا یہ زرّیں موقع ہے جو بالکل بخت و اتفاق سے اس کے ہاتھ آگیا ہے۔ وہ اسے غنیمت جانتے ہوئے اس سے پُورا پُورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کریگا۔

ان حالات میں جب کہ یورپین طاقتوں کی توجہ اپنے مسائل کے حل کرنے میں اُلجھی ہوئی ہو، جب مسلمان ممالک پر شدید اضمحلال طاری ہو رہا ہو اور اُن کی خداداد صلاحیتیں ایک دوسرے کو گرانے میں صرف ہو رہی ہوں، امریکہ کی بھارت کو امداد مشرق کے لیے ایک زبردست خطرہ

ثابت ہو سکتی ہے۔ حالات کے تیور اس بات کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ اینگلو امریکن بلاک بھارت سے نہ صرف چین کی بڑھتی ہوئی یلغار کو روکنے کا کام لینا چاہتا ہے، بلکہ اس نے اپنی خارجہ پالیسی کو اب جس نہج پر ترتیب دیا ہے، اس کے پیش نظر وہ اپنے استعماری مفادات کی حفاظت و پاسبانی کے لیے بھی بھارت پر مکمل اعتماد کر سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے جس ملک پر اُس کی نگاہِ انتخاب شروع ہی سے اُٹھ رہی تھی وہ صرف بھارت ہی تھا لیکن اس کی غیر جانبداری کے دعووں کی وجہ سے اُسے اس پر بھروسہ کرنے میں کچھ تامل ہو رہا تھا۔ اب جبکہ بھارت نے اپنی وفاداری کا کھلے بندوں اعلان کر دیا ہے تو امریکہ کے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ وہ اس ملک سے اپنے رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے ہر قسم کی تدابیر اختیار کرے گا۔ جس موقع کے لیے وہ پندرہ سال سے برابر منتظر چلا آ رہا تھا، اُس کے حاصل ہو جانے کے بعد وہ اس سے یقیناً فائدہ اٹھائے گا اور اس معاملے میں وہ کسی دوسرے ملک کے احساس کو راہ میں حائل نہ ہونے دیگا۔ بھارت کی دوستی اُسے سب سے زیادہ عزیز ہے اور اس کی رفاقت پر اُسے سب سے زیادہ اعتماد بلکہ ناز ہے اس لیے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ کسی وقت ہمارے ساتھ بھی اُس کی راہ و رسم تھی، اور وہ اس کا پاس رکھتے ہوئے کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے گا جس سے ہمارے مفادات کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو، وہ حقائق کی دنیا میں نہیں بلکہ خواب و خیال کی دنیا میں بستے ہیں اور اس کے طلسم سے جتنی جلدی وہ آزاد ہو جائیں اتنی ہی یہ چیز اُن کے اپنے حق میں اور ملک و ملت کے حق میں مفید ثابت ہوگی۔

اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہمیں اصل خطرہ امریکی امداد کا نہیں بلکہ اس کے غلط استعمال کا ہے۔ اگر ہمیں یہ یقین ہوتا کہ بھارت اِس امداد کو صرف اپنے ملکی استحکام میں استعمال کریگا تاکہ وہ چین کے جارحانہ حملوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے تو ہمیں قطعاً کسی قسم کی تشویش لاحق نہ ہوتی۔ ہم خود اس بات کے دل سے آرزومند ہیں کہ ہر ملک بجائے خود اتنا مضبوط ہو جاتے کہ وہ استعمار پرستوں کے باطل عزائم کو ناکام بنا سکے اور اپنی آزادی اور خودمختاری کی

اچھی طرح حفاظت کر سکے۔ سیاسی غلامی سے زیادہ دنیا میں کوئی بڑی لعنت نہیں اور آزادی سے زیادہ قابلِ قدر کوئی نعمت نہیں۔ ہم جس طرح خود آزاد رہنا چاہتے ہیں اسی طرح دوسری قوموں کے لیے بھی یہ حق تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ خالقِ کائنات نے انسانوں کو آزاد پیدا کیا ہے اس لیے بندوں کو قطعاً یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انہیں اپنی بندگی پر مجبور کریں۔ یورپین اقوام نے گذشتہ دو صدیوں میں مشرق کی بے بس قوموں پر جس طرح دستِ ظلم دراز کیا ہے اُس کی تلخ یاد کبھی محو نہیں ہو سکتی۔ ہم ہر اُس قوم کے مددگار ہیں جو اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے اور اس سے ہر قسم کا تعاون کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

ہمیں اس امداد میں اصل خطرہ جو نظر آرہا ہے وہ یہ ہے کہ مال و متاع اور اسلحہ کی یہ بھاری مقدار مشرق کو کسی وقت بھی شعلۂ جوّالہ بنا سکتی ہے اور بھارت اس کی بدولت خود اپنے ہمسایہ ممالک کے لیے ایک بڑا استعماری خطرہ بن سکتا ہے جس کے اوّلین شکار مسلم ممالک ہی ہوں گے آزادی کے بعد بھارت ملک کے اندر اور باہر جس نہج پر ترقی کر رہا ہے اُس نے ہمارے ان خدشات کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔

اسے مشرق کی بدنصیبی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی سرزمین میں دوسرے ایشیائی ممالک کی طرح روایات کے بندھن بڑی سرعت کے ساتھ ٹوٹ رہے ہیں۔ اگر گاندھی جی آج زندہ ہوتے تو شاید وہ اس کی کچھ فکر کرتے لیکن اس وقت اس ملک کی قیادت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے اُن کے نزدیک مذہب اور اُس کی روایات محض جاہلیت کی یادگار ہیں جن سے قوم کو جلد از جلد نجات دلانا ہی اس کی حقیقی خیر خواہی ہے۔ پھر ہندو قوم چونکہ انگریزی اقتدار کے بالکل آغاز ہی سے مغربی اقدارِ حیات پر فریفتہ ہو چکی تھی اس لیے اس نے دھرم کی عزت و توقیر کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کبھی بھی دھرم کو اپنی حیاتِ اجتماعی کی بنیاد اور اساس بنانے کا عزم نہیں کیا۔ اُس کے نزدیک اس کی حیثیت ہمیشہ محض پوجا پاٹ کی رہی ہے اس سے آگے بڑھ کر وہ اپنی اخلاقی

قدریں کسی دھرم سے لینے کے بجائے سراسر مادیت اور قوم پرستی کے نظریات سے لیتی ہے۔

ہندو مذہب نے اس قوم کے اندر اپنی الگ قومی حیثیت کا احساس تو پیدا کر دیا ہے لیکن وہ اس کے مختلف طبقوں کے درمیان اتحاد اور اتفاق پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ چنانچہ اس قوم نے مغرب کی پیروی میں اپنے پریشان اجزا کے اندر ایک مقصدی ربط پیدا کرنے کے لیے ہمیشہ خاکِ وطن کی کشش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ نیشنلزم کے دورِ عروج میں یہ نسخہ کافی مفید ثابت ہوا لیکن زمان و مکان کے سمٹ جانے کی وجہ سے، جب جغرافیائی وحدتیں روز بروز کمزور ہوتی جا رہی ہیں، تو اب نیشنلزم کے اندر یہ تاثیر باقی نہیں رہی ہے کہ وہ اس قوم کے اندر فکر و نظر اور جذبہ و احساس کی ہم آہنگی پیدا کر کے اُسے ایک وحدت بنا دے۔

ایک ایسا ملک جو نہایت ہی وسیع و عریض رقبے میں پھیلا ہوا ہو جس کے باشندوں میں رنگ و نسل، زبان اور تہذیب کے بے شمار امتیازات پائے جاتے ہوں اور ان امتیازات نے اُن کے درمیان منافرت بھی پیدا کر دی ہو، وہاں روایات کا ختم ہو جانا بڑا تشویشناک ہے۔ کیونکہ ان کے خاک و خون سے ہمیشہ جارحانہ قوم پرستی نے جنم لیا ہے۔ اس طرح کے منتشر اجزاء کو جوڑنے کے لیے اخلاق سے بے نیاز لیڈر ہمیشہ نفرت و عداوت، اور توسیعِ اقتدار کی ہوس سے کام لیتے رہے ہیں۔ اور اس کے نتائج پہلے دوسروں کے لیے، اور پھر خود ان کے لیے تباہ کُن ثابت ہوتے ہیں۔

جرمنی کی تاریخ اس حقیقت پر پوری طرح گواہ ہے۔ مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاحِ مذہب کے بعد جب لوگوں پر مذہبی روایات کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو پھر انہیں باہم متحد رکھنے کے لیے ایک ایسی قوتِ قاہرہ کی ضرورت پیش آئی جو ان کے مائل بہ انتشار اجزا کے درمیان طاقت اور جبر کے زور سے اتحاد و اتفاق پیدا کر سکے۔

اس اندھی بہری قوت نے اہلِ جرمنی سے ہر اُس چیز کا مطالبہ کیا جس کا مذہب ایک

انسان سے عام طور پر تقاضا کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے ملک اور اس کے سربراہ کو کبریائی کے اُس بلند و بالا مقام پر فائز کر دیا جو صرف خالقِ کائنات کا حق ہے۔ چنانچہ جرمنی کی کتاب الایمان کا کلمۂ شہادت یہ قرار پایا:

"ہٹلر کی خدمت جرمنی کی خدمت ہے اور جرمنی کی خدمت خدا کی خدمت ہے"

پھر جارحانہ قوم پرستی کے جذبات اُبھارنے کے لیے یہ چیز بھی انتہائی ضروری تھی کہ عوام کے دماغ میں اس باطل خیال کی تخم ریزی کی جائے کہ حق اور صداقت صرف انہیں کی میراث ہے اور ہر وہ عقیدہ یا مسلک جس نے جرمنی کی سرزمین میں جنم نہیں لیا وہ سراسر غلط ہے۔ اس قوم پرستانہ ذہنیت اور غیر ملکی چیز کے خلاف عصبیت یہاں تک بڑھ گئی کہ اہلِ جرمنی نے کسی دوسرے ملک سے آئی ہوئی ان اعلیٰ قدروں کو بھی ماننے سے انکار کر دیا جنہیں خدا کے پاک بندوں نے وقتاً فوقتاً پیش کیا تھا اور جن میں کسی ایک قوم یا ملک کے مفاد کی حفاظت مقصود نہ تھی بلکہ پوری نوعِ انسانی کی فلاح مطلوب تھی۔ جرمن کے مشہور ماہر تعلیم پروفیسر اٹر کے یہ الفاظ اس تنگ نظری اور تعصب کی پورے طور پر غمازی کرتے ہیں:

"ہمارے بچے کیوں ایک غیر قوم کی تاریخ پڑھیں، انہیں کیوں ابراہیم اور اسحاق کے قصے سنائے جائیں۔ ہمارا خدا جرمنی ہونا چاہیے"

اس کے علاوہ لوگوں کے اندر نخوت اور تکبّر کے جذبات کی آبیاری کر کے ایک غلط قسم کا احساسِ عظمت ان میں پیدا کرنے کی مذموم کوشش کی گئی تاکہ جرمنی کے باشندے اپنے آپ کو دوسرے سے بالاتر سمجھ کر اُن کے ساتھ کبھی انسانوں کا سا برتاؤ کرنے پر آمادہ نہ ہونے پائیں۔ ان کے ذہن میں یہ باطل خیال ایک سوچے سمجھے منصوبے کے ساتھ بٹھایا گیا کہ وہ جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں وہ دنیا کی بہترین نسل ہے اور علوم و آداب، فنی کمالات اور نوادرات کا جو بیش قیمت سرمایہ دنیا میں موجود ہے وہ سب انہیں کی ذہنی کاوشوں کا رہینِ منت ہے۔

اہلِ جرمنی کے اندر جوشِ عمل پیدا کرنے اور اُن کی قوتوں کو ایک راہ پر لگانے کے لیے بھی مثبت داعیات سے قطعاً کوئی فائدہ نہ اٹھایا گیا بلکہ قوم کے دل و دماغ میں نفرت اور خوف کے جذبات پیدا کیے گئے تاکہ وہ دیوانی ہو کر اپنے سربراہوں کے اشاروں پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہو جائے اور نتائج اور عواقب سے یکسر آنکھیں بند کرلے۔

ان باطل افکار و نظریات اور ان غلط احساسات و جذبات کا جو نتیجہ نکلا وہ سب کے سامنے ہے۔ ایک قوم جو کبھی عظیم الشان روایات کی حامل تھی، جس نے علم کی ترقی اور تہذیب و تمدن کی تشکیل میں بیش بہا خدمات سرانجام دی تھیں۔ اُس پر یکایک جارحانہ قوم پرستی کا جنون سوار ہو گیا اور اُس نے اپنی عقلی اور فکری قوتوں کو تپاک کر، ایک ایسی مہم کا آغاز کیا جس نے پوری دنیا کو برباد کر کے رکھ دیا اور آخر کار خود اس کی کامل شکست پر منتج ہوئی۔

ہندوستان میں حالات کی موجودہ رفتار اسی جارحانہ قوم پرستی کے خطرہ کی طرف واضح اشارہ کر رہی ہے۔ خاکِ وطن سے محبت میں غلو اور اس کی تقدیس و تکریم میں مبالغہ آمیزی کے ذریعہ بھارت کو کبریائی کے اُسی مقام پر لانے کی کوششیں ہو رہی ہیں جس پر کہ اہلِ جرمنی نے المانیہ کو فائز کیا تھا۔ پھر لوگوں کے اندر مصنوعی خوف و ہراس پیدا کرنے اور دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات اُبھارنے کے لیے تمام وہ حربے استعمال کیے جا رہے ہیں جو جارحانہ قوم پرستی کی علمبردار قومیں بالعموم استعمال کرتی ہیں۔ روایات کے بندھن ٹوٹنے کی وجہ سے ملک کے اندر جس قسم کا انتشار پیدا ہو رہا ہے اس سے آمریت کے حق میں فضا خود بخود سازگار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ چنانچہ اب اقتدار سمٹ کر ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں منتقل ہو رہا ہے جو انتہائی متعصب اور تنگ نظر ہے اور اپنے سوا ملک کے اندر اور باہر کسی وجود کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اور ان سب سے بڑھ کر اس ملک میں نسلی تفوق کا شیطانی فلسفہ، جو جارحانہ قوم پرستی کی جان ہے، ہندوؤں کے بااثر حلقوں میں بڑی تیزی کے ساتھ

سرایت کر رہا ہے۔ مسٹر جسٹس ایس ایس دھاون، جو الہ آباد ہائی کورٹ کے ایک ممتاز رکن ہیں، انہوں نے اپنی ایک تقریر میں اس کی طرف نہایت واضح الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی کے فلسفے کے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"ایک عظیم قوم اچھے نظم و نسق کے ساتھ جس کی کابینہ میں اوسط ذہن کے ایسے انسان ہوں جن کے پاس فلسفہ اخلاق ہو، اپنے مقصود کو پا سکتی ہے۔ لیکن ایسے قابل حکمرانوں کے ساتھ جن کے پاس شیطانی فلسفہ ہو قوم کو تباہی و بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔"

"مضبوط فلسفۂ اخلاق کے بغیر فولاد کے کارخانے ملک کو نہیں بنا سکتے۔ ہٹلر کے جرمنی نے صنعت کاری میں یورپ کو مات کر دیا تھا اور ہٹلر اپنی نجی زندگی میں ایمان دار اور قابل آدمی بھی تھا لیکن اس نے اپنے شیطانی فلسفے "نسل برتر" کی وجہ سے بنی نوع انسان کو تباہی میں مبتلا کر دیا۔ ہٹلر کے فلسفہ کی ایک کروڑ ایشیائی، یورپی، اور امریکیوں اور ساٹھ لاکھ یہودیوں کی لاشیں گواہ ہیں۔"

"علی گڑھ اور میرٹھ میں جو فسادات ہوئے ہیں ان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس ہولناک سماجی فلسفہ کے جراثیم ہم میں نفوذ کر گئے ہیں اور اگر ان کا قلع قمع نہ کیا گیا تو ہندوستان میں جنوبی افریقہ کی ریاست، بلکہ ہٹلر کے جرمنی سے زیادہ حالات خراب ہو جائیں گے۔"

ان حالات میں جب انسانوں کا کوئی گروہ جارحانہ قوم پرستی کے نشہ میں بدمست ہو کر آگے بڑھ رہا ہو، اُس کے ہاتھ میں غیر معمولی طاقت کا آجانا، اُس کے اپنے حق میں بھی اور پوری انسانیت کے حق میں بھی سخت خطرناک ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے کہ اگر ہمسایہ ممالک کسی تشویش کا اظہار کریں تو یہ بالکل فطری امر ہے۔ پاکستان کو امریکہ سے یہ گلہ نہیں کہ اس نے بھارت کو مضبوط بنانے میں مدد دی ہے بلکہ اُسے اصل شکایت یہ ہے کہ وہ محض اپنے مفاد کی خاطر آس پاس کی دوسری قوموں کے

مفادات سے یکسر بے پروا ہو کہ بھارت کو اس قدر زیادہ طاقت فراہم کر رہا ہے جو دوسرے ممالک کے لیے سخت خطرہ کا موجب بن سکتی ہے۔ بھارت میں جارحانہ قوم پرستی کا جنون جس تشویشناک رفتار سے بڑھ رہا ہے اس کا ہلکا سا اندازہ اُن فسادات سے کیا جا سکتا ہے جو گذشتہ پندرہ برسوں میں وہاں مسلسل ہوتے رہے ہیں۔ اور ان میں ملک کی سب سے بڑی اقلیت (مسلمان) کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک کیا گیا ہے وہ اپنی ہولناکیوں کے اعتبار سے اُس سلوک سے کسی طرح بھی مختلف نہیں جو جرمنی میں ہٹلر نے یہودیوں کے ساتھ کیا تھا۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ بھارت کے وہ سربراہ جو خود برطانیہ کے ظلم و ستم سے ابھی ابھی بچ کر نکلے تھے۔ اور جنہیں قدرت نے مظلوموں کی حفاظت اور پاسبانی کا مقدس فرض سونپا تھا وہ خونریزی، سفاکی اور زیردست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے اس قسم کے متعصب اور جارحانہ عزائم رکھنے والے گروہ سے یہ امید کیسے رکھی جا سکتی ہے کہ جب اس کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو گا تو وہ دوسری قوموں کو تباہ و برباد کرنے میں کسی قسم کا دریغ کریگا۔

اسوقت جبکہ یہ سطور لکھی جا رہی ہیں مسئلہ کشمیر کے حل کرنے کے لیے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان مذاکرات پانچویں دور میں داخل ہو رہے ہیں انسانیت کا ہر بہی خواہ اس بات کا دل و جان سے آرزومند ہے کہ اس مسئلہ کا کوئی منصفانہ اور باعزت حل نکل آئے اس سلسلے میں ہم بھارت کو پھر ایک بار اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ وہ کشمیر کے بارے میں اپنی چالبازیوں پر نازاں ہونے کی بجائے اپنے موقف کے اخلاقی پہلوؤں پر غور کرے اُس کے سربراہوں نے تاریخ میں اُن روسیاہ قوموں کی تصویریں یقیناً دیکھی ہونگی جنہوں نے اپنی ناانصافیوں کی وجہ سے اس کرۂ ارضی کو جہنم بنا دیا اور ان کے مقابلے میں ان خوش نصیب لوگوں کے چہروں پر بھی نگاہ ڈالنے کا موقع ملا ہو گا۔ جنہوں نے انسانوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنے کی کوشش کی۔ بھارت کیلئے یہ ایک فیصلہ کن مرحلہ ہے کہ وہ اب اپنی قومی تصویر آویزاں کرنے کے لیے کس گیلری کو منتخب کرتا ہے۔

اس وقت اگر اُس نے طاقت کے نشے میں ظالم اور سفاک قوموں میں اپنی جگہ کا انتخاب کیا

تو یہ ایک ایسا شرمناک فیصلہ ہوگا جس پر اُس کی آئندہ نسلیں کبھی بھی ندامت کے مارے سر نہ اٹھا سکیں گی۔

بے جا نہ ہوگا کہ ایک بات ہم اس نازک مرحلہ پر اپنے بھائی بندوں کی خدمت میں بھی عرض کردیں۔ سیاست میں بلاشبہ حتمیت اور قطعیت نہیں ہوتی اور اس کے نقشے میں ہر وقت تبدیلی کا امکان موجود رہتا ہے لیکن انہیں اس چیز کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ ایک بااصول سیاست داں کے ذہن میں ایک ایسا بنیادی خاکہ بہرحال ضرور ہوتا ہے جس میں وہ کسی قسم کا تغیّر و تبدّل کرنا گوارا نہیں کرسکتا۔ براہ کرم مسئلہ کشمیر کو حل کرتے وقت اس اصول کو کسی منزل پر بھی نظر انداز نہ کیجیے۔ گذشتہ پندرہ سالوں میں ہم پوری دنیا کو یہ باور کراتے رہے ہیں کہ کشمیر کو نہ ہم خود قوت کے زور سے اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہیں اور نہ یہ حق ہندوستان کو دیتے ہیں بلکہ اس امر کا فیصلہ کہ یہ خطّہ ہمارے ساتھ الحاق کرے یا بھارت کے ساتھ، سراسر کشمیری عوام کی مرضی پر موقوف ہے۔ یہی ایک موقف ہے جس کی تائید عدل و انصاف اور اخلاق سے ہوتی ہے اور ہم اس معاملے میں پوری انسانیت کے ضمیر کو اپیل کرسکتے ہیں۔ اب اس وقت ہم اگر اپنے اس اخلاقی موقف کو چھوڑ کر کشمیر کی تقسیم پر رضامند ہوجائیں تو دنیا میں آخر ہماری کیا وقعت باقی رہ جائیگی۔ کیا لوگ پھر یہ سمجھنے میں حق بجانب نہ ہونگے کہ ہمارا یہ موقف بالکل ڈھونگ تھا جسے ہم نے محض دنیا کو دھوکہ دینے کے لیے رچا رکھا تھا۔ کشمیر کی تقسیم اگر اصولاً صحیح اور درست ہے تو پھر چند میلوں کے رقبے کا قضیہ کوئی ایسا قضیہ نہیں جس کے لیے اتنی ہٹ دھرمی دکھائی جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچیے کہ کشمیری عوام پر ہمارے اس بے اصولے پن کا کیا ردِ عمل ہوگا۔ کیا ہماری اس حرکت سے اُن کے دل و دماغ میں یہ خیال جاگزیں نہ ہوگا کہ اہلِ کشمیر کی حیثیت ایک قوم کی نہیں بلکہ بے زبان بھیڑ بکریوں کی سی ہے جن کا پاکستان اور بھارت جس طرح چاہیں سودا چکا سکتے ہیں۔

پھر ہم یہ بات بھی سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر اس وقت ہم مسئلہ کشمیر کے حل کرنے پر کیوں اتنے مُصر ہیں۔ بھارت اگر اپنے ملک کی سیاسی صورتِ حال کے پیشِ نظر اسے حل کرنے کے لیے مضطرب ہے، تو اس کی بہرحال ایک وجہ ہے لیکن پاکستان اس معاملے میں جس بے تابی کا اظہار کر رہا ہے اُس کی مصلحتیں ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔